© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

علم کا معیار جس طرح مشرقی ممالک میں گرا ہے اسی طرح مغربی ممالک میں بھی اچھا خاصا پست ہوا ہے۔ اس پستی کے یوں تو متعدد وجوہ ہیں مگر ان میں دو خاص طور پر اہم ہیں۔ اہل یورپ کے ذہین و فطین انسان برق و بخارات' میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں اور انسان کی داخلی کیفیات ان کے فہم و ادراک سے اوجھل ہو گئی ہیں درآنحالیکہ اس کائنات میں انسان کی مرکزی حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے زیادہ توجہ انسان کے اخلاقی اور روحانی پہلو پر دی جائے۔ مشہور نوبل یافتہ مفکر الیکسیس کیرل نے عہد جدید کے انسان کی اس تنگ نظری اور یک رُخے پن کا اپنی معروف کتاب " انسان نامعلوم" میں دل کھول کر رونا رویا ہے اور اسے دورِ حاضر کے انسان کا سب سے بڑا المیہ قرار دیا ہے۔

علمی معیار کی پستی کی دوسری بڑی وجہ مغربی تہذیب کا انحطاط ہے۔ جب کوئی تہذیب دُنیا میں اُبھرتی ہے تو اس تہذیب کے علمبردار اسے دوسری تہذیبوں پر غالب کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرتے ہیں لیکن اس تہذیب کے غلبے کے بعد جب اس کے ثمرات سے وہ لوگ بہرہ ور ہونا شروع ہوتے ہیں تو ان کے اندر سہل پسندی آجاتی ہے اور وہ قوتِ فکر اور جوشِ عمل دونوں لحاظ سے زوال کی راہ پر چل نکلتے ہیں۔ مگر اس دورِ انحطاط میں بھی کبھی کبھار ایسی کتابیں دیکھنے میں آتی ہیں جو سائنس و صنعیات سے ہٹ کر انسانی مسائل سے بحث کرتی ہیں اور جن میں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی کا جوہر بھی موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح کی ایک کتاب حال ہی میں " ہم تاریخ سے سبق کیوں حاصل نہیں کرتے" لندن سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب حجم کے اعتبار سے اگرچہ مختصر ہے لیکن مباحث کے لحاظ سے بڑی جامع اور فکر انگیز ہے اور فاضل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مصنف نے اس میں اُن حقائق کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو حیات انسانی کے بنیادی حقائق ہیں لیکن جن سے دورِ حاضر کا انسان مسلسل اغماض برت رہا ہے۔ ان صفحات میں اس مرتبہ اس کتاب کے مرکزی موضوع پر چند معروضات پیش کی جائیں گی۔

کتاب کا مصنف نامور فوجی جنرل اور مؤرخ سر لیسیل لڈل ہارٹ ہے جس نے میدانِ جنگ میں اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بنا پر کچھ نتائج اخذ کیے ہیں جن میں بعض غلط بھی ہو سکتے ہیں اور بعض صحیح بھی لیکن اس کے تجزیوں سے یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر سچائی کے لیے طلب صادق بدرجہ اتم موجود ہے۔

حق و صداقت کے بارے میں اس کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ انسان کے دل کی پکار ہونے کی وجہ سے یہ اس کی اپنی ہی بیش قیمت متاع ہے لیکن بعض کمزوریوں کی بنا پر وہ اپنی اس متاع ہی سے ہمیشہ خائف رہا ہے اور اسے من وعن تسلیم کر کے اس کے تقاضے پورے کرنے میں اس نے بخل سے کام لیا ہے۔ یہ اسی جراٗت کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ انسان نے اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے بجائے کہ وہ اپنے اندر حق و صداقت کی راہ پر گامزن ہونے کی ہمت نہیں پاتا اس سے اعراض کے لیے مختلف حیلے بہانے تراش رکھے ہیں جن کی نوعیتیں اگرچہ لاتعداد ہیں مگر بنیادی طور پر اُنھیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ان حیلوں کی پہلی قسم یہ ہے کہ خود حق و صداقت کے بارے ہی میں ذہنوں میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کیے جائیں اور لوگوں کو یاور کرایا جائے کہ جس بات کو وہ حق ماننے پر مصر ہیں اس کا حق ہونا ہی محلِ نظر ہے۔ مثلاً خدا کا وجود کائنات کی ایک ایسی حقیقت ہے جس پر کائنات کا ہر ذرہ گواہ ہے لیکن چونکہ خدا کے اقرار سے انسان پر بعض ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اس لیے ان ذمہ داریوں کے بوجھ سے بچنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ خدا کے وجود کے بارے ہی میں ایسے مباحث اُٹھائے جائیں جن سے اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی متنازعہ فیہ مسئلہ بن جائے اور لوگوں کے لیے کھلے یا دبے لفظوں میں اس کے انکار کی گنجائش پیدا ہو یا اگر وہ اپنے آپ کو اس جسارت پر آمادہ نہ کر سکیں تو کم از کم ان کے اندر خدا کے عطا کردہ ضابطوں کے بارے میں بغاوت کا رجحان اُبھرنا شروع ہو جائے اور اس کی سب سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آسان صورت یہ ہے کہ عوام کے دل و دماغ میں یہ باطل خیال راسخ کیا جائے کہ عملی زندگی میں جو کچھ موجود ہے یا جو کچھ ہو رہا ہے یہی اس کے صحیح اور برحق ہونے کی سب سے زیادہ وزنی دلیل ہے۔ حق سے اعراض کا یہ انداز اگرچہ بڑا عام ہے لیکن اگر اس کی تباہ کاریوں اور ستمرانیوں کا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اِس آسمان کے نیچے اِس سے زیادہ گمراہ کن اور ہلاکت خیز کوئی دوسرا نظریہ نہیں ہو سکتا۔ اس نظریے کا مقصد یہ ہے کہ جو بُرائیاں اس وقت دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں ان کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت کے جو جذبات موجزن ہیں وہ ختم ہو جائیں اور انسانی معاشرے میں بُرائی کے عام چلن کو ہی اس کے اچھائی ہونے کی دلیل سمجھ لیا جائے۔ اس باطل نظریے نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو جس طرح گناہوں سے آلودہ کیا ہے اس کا مشاہدہ ہر شخص اپنے گردوپیش پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنے سے بآسانی کر سکتا ہے۔ آپ کسی مرتشی سے یہ کہیں کہ رشوت لینا تو خدا اور خلق دونوں کی نظر میں جرم ہے اور آخرت میں اُسے اس گناہ کی پاداش میں دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا تو وہ بڑی بے تکلفی سے یہ جواب دیتا ہے کونسا شخص اس سے بچا ہُوا ہے۔ جن جن آسامیوں پر رشوت لینے کے مواقع میسّر ہیں وہاں سب اس بُرائی میں ملوث ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اہلکاروں کی اکثریت رشوت خور ہے لہٰذا صحیح طرزِ عمل رشوت خوری ہی ہے اور جو حقیر سی اقلیت اس بُرائی سے دامن کش ہے وہ موردِ الزام ہے۔

انفرادی زندگی سے ہٹ کر اجتماعی زندگی پر غور کریں تو آپ کو وہاں بھی یہی باطل فلسفہ ہر شعبۂ حیات میں کارفرما نظر آئے گا مثلاً آپ لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو قانون شکنی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور آپ اُن سے کہتے ہیں کہ بھلے آدمیوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی تو وہ اپنے جُرم کے دفاع میں یہ فرماتے ہیں کہ سب لوگ اسی طرح کر رہے ہیں۔ اگر کوئی سیاسی جماعت تختِ اقتدار پر قابض ہونے کے لیے عوام سے جھوٹے وعدے کرے اور پھر اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد وہ ان وعدوں کو پوری ڈھٹائی سے توڑنے لگے اور اسے کہا جائے کہ دیکھیے آپ نے ان وعدوں کے ساتھ قوم سے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا تھا لہٰذا اب ان وعدوں کا پاس کیجیے تو دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ ان وعدوں کی تکمیل تو ہو رہی ہے حالانکہ عملاً سب کچھ ان وعدوں کے خلاف کیا جاتا ہے مگر پوری دنیا کے سامنے بغیر کسی احساسِ ندامت کے جھوٹ بولا جاتا ہے اور نجی محفلوں میں جب اپنے کارکن اس وعدہ خلافی پر اضطراب کا اظہار کرتے ہیں تو انہیں یہ کہہ کر مطمئن کیا جاتا ہے کہ حکمرانی اور فرمانروائی کے یہی انداز ہیں یا بالفاظِ دیگر کذب و فریب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی سے نظامِ مملکت بطریقِ احسن چلایا جاسکتا ہے اور اس کے حق میں وہی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ حکمرانوں کی عظیم اکثریت دجل و فریب کی راہ پر گامزن رہ کر ہی اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکتی ہے۔

"جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ موجود ہے وہی صحیح اور برحق ہے" کے باطل فلسفے نے معاشرت اور سیاست کو ہی تباہ نہیں کیا بلکہ انسانی اخلاق کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اور اخلاقی بے راہ روی کی مدافعت کے لیے اسی فلسفے کے اسلحہ خانے سے دلائل کے ہتھیار فراہم کیے گئے ہیں۔ یہاں ہم اس اخلاقی انحطاط کی ایک دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ صنفی جبلت ایک فطری داعیہ ہے جس کی تسکین کے لیے خالقِ کائنات نے دو مختلف اصناف کو پیدا کیا ہے تاکہ ذکور و اناث کے باہمی ربط سے اس جبلت کی تسکین کا سامان ہو سکے لیکن چونکہ اس جبلت کے اندر غیر معمولی قوت و طاقت پائی جاتی ہے اس لیے اس بات کا ہر وقت امکان ہو سکتا ہے کہ کہیں یہ داعیہ اپنی فطری حدود سے تجاوز کر کے معاشرے کو تہ و بالا نہ کر دے اس لیے اس کائنات کے مالک نے اس جبلت کو ہی انسان کی پیدائش کا ذریعہ بنایا ہے تاکہ اس کا رخ آزاد شہوت رانی کے بجائے تخلیق و تعمیر کی طرف رہے اور اس طرح یہ قوت اپنی فطری حدود کے اندر رہ کر نسلِ انسانی کے بقا اور خاندانی نظام کے استحکام کا ذریعہ ثابت ہو۔ پھر اس جبلت کے فطری مقاصد کے حصول کے لیے نکاح کے بندھن معرضِ وجود میں آئے اور ان سے باہر صنفی تعلقات کے قائم کرنے کو گناہ اور جرم قرار دے دیا گیا لیکن جو لوگ صرف جنسی لذت کے دلدادہ تھے اُنھیں ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں قبول کرنا کس طرح گوارا ہو سکتا تھا اس لیے انہوں نے بڑی دلیری کے ساتھ رشتۂ مناکحت کے تقدس کو پامال کیا۔ لیکن اس کھلی ہوئی بے حیائی کے باوجود چونکہ انسان کا اخلاقی احساس اور معاشرے کا اجتماعی ضمیر اس قبیح فعل کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے۔ اس لیے اس جرم کا ارتکاب کرنے والے اپنے اندر کرب محسوس کرتے اور معاشرہ بھی انہیں عزت و احترام کا کوئی مقام دینے پر آمادہ نہ ہوتا۔ لیکن "کسی چیز کے موجود ہونے کی بنیاد پر اس کے برحق ہونے" کے گمراہ کن نظریے نے اس برائی کے بارے میں بھی لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو بدل کر رکھ دیا ہے اور یہ اسی نظریے کا کرشمہ ہے کہ آج آزاد شہوت رانی اور صحبت ہم جنس جیسے گھناؤنے جرائم فطرت کے جائز تقاضے قرار پائے جانے لگے ہیں اور جو لوگ ان کے خلاف آواز اُٹھاتے ہیں اُنہیں انسانیت کا دشمن گردانا جا رہا ہے۔ فطرت کے ان "پرستاروں" کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوتِ ادراک اس حد تک مفلوج ہو چکی ہے کہ وہ عملِ قومِ لوط کو قانونی جواز فراہم کر چکے ہیں بلکہ اس قانونی جواز کی بنیاد پر دو نوجوانوں کے مابین کلیسا کے اندر مذہبی رسومات کے ہجوم میں رشتہ مناکحت بھی استوار ہو چکا ہے۔ اس خوفناک نوعیت کا اخلاقی انحطاط یکایک نمودار نہیں ہوا بلکہ ایک صدی سے زائد کے غلط افکار و نظریات نے اسے بتدریج جنم دیا ہے اور اس کی تہ میں وہی غلط مفروضہ کار فرما ہے کہ جو کچھ موجود ہے وہی صحیح ہے۔ فرائڈ نے اس مفروضے کی بنیاد پر ہی اپنا سارا فلسفہ مرتب کیا۔ چونکہ صنفی جبلت انسانی فطرت کا ایک حصّہ ہے اس لیے اس کی تسکین ضروری ہے۔ یہاں تک تو بات بالکل درست ہے اور اس سے کسی شخص کو بھی انکار نہیں ہو سکتا لیکن فرائڈ اور اس کے پیرو اس جبلت پر کسی قسم کی پابندی کو انسان کے ذہنی نشوونما کے لیے سمِ قاتل سمجھتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ چونکہ یہ جبلت ایک حقیقت ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اس کی تسکین کے لیے آزاد ہو اور معاشرہ اس پر اخلاقی پابندیاں عائد کرنے سے گریز کرے۔ معاشرے کے علاوہ خود فرد کو یہ بات ذہن نشین کرائی گئی کہ آخر انسان کا وہ داعیہ جو اس کی فطرت میں سمویا ہوا ہے۔ اس کی تکمیل کی کسی ایسی صورت کو جو اُسے پسند ہو کس طرح گناہ کہا جا سکتا ہے؟ جو جذبہ انسان کی فطری اُمنگ ہے اس کے اظہار پر کسی نوع کی پابندی سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔ اس بنا پر نیکی اور بدی کے دینی تصوّرات بالکل اوہام ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے انسان پر نارروا پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ فطری داعیات کی تسکین کا ہر راستہ خیر اور بھلائی کا راستہ ہے اور اس میں سے کسی راستے کو گناہ کا راستہ قرار دینا سراسر ناانصافی ہے۔ اس سارے فلسفے کی بنیاد وہی نظریہ ہے کہ چونکہ صدیوں سے لوگ اخلاقی حدود کو پھاند کر اپنی جنسی بھوک مٹاتے رہے ہیں اس لیے ان حدود کا قائم کرنا ہی غیر فطری فعل ہے اور صحیح اور معقول روش یہی ہے کہ جن حدود کو لوگ توڑتے رہے ہیں انہیں بالکل مٹا دیا جائے۔

صحبت ہم جنس کو قانونی جواز دینے کے لیے جس وقت انگلستان کے ایوانِ بالا اور ایوانِ زیریں میں بحث ہو رہی تھی اور اس کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل پیش کیے جا رہے تھے اور اخبارات میں یہ جرم موضوعِ بحث بنا ہوا تھا تو اس کی تائید میں ہر پھر کر یہی دلیل پیش کی جاتی رہی کہ اگر یہ گناہ انسانی فطرت کا تقاضا نہیں تو صدیوں سے لوگ اس کا ارتکاب کیوں کر رہے ہیں؟ چونکہ ہر دور میں لوگ اس میں ملوث رہے ہیں اس لیے اسے جرم قرار دینا ہی غلطی ہے۔ اسی منطق کے تحت مغربی مفکرین ہر بُرائی کو بھلائی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر عیب کو ہنر اور ہر بدی کو نیکی تسلیم کروانے پر مصر ہیں اور اسے اپنا فکری کمال اور انسانیت پر احسانِ عظیم خیال کرتے ہیں - فرائڈ کی تعلیمات نے معاشرے پر جو اثرات مرتب کیے ہیں ان سب کو سمیٹ کر اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اخلاق کی دنیا میں اُس کا سب سے بڑا "کارنامہ" یہ ہے کہ اس نے انسان کے دل و دماغ سے گناہ کا تصوّر مٹانے کی کوشش کی ہے اور اسے یہ باور کرایا ہے کہ نیکی اور بدی کے امتیازات محض خیالی باتیں ہیں اور اخلاقی ضابطوں کا وجود بیکار کی زنجیریں ہیں جو انسانیت کی دشمنی میں اسے پہنائی گئی ہیں تاکہ وہ اپنی قوتوں کو صحیح راہ پر لگانے میں ناکام رہے -

---

"جو موجود ہے وہی صحیح ہے" کے اصول کے مطابق دورِ جدید میں انسان کی معیشت کو بھی اخلاقی بندھنوں سے آزاد کیا گیا ہے - انسان کے ذہن میں شروع ہی سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا احساس ایک لو کی طرح موجود رہا ہے جس کی وجہ سے اس کی باطنی زندگی اخلاقی احساسات سے منوّر رہی ہے - جن لوگوں کو ہوسِ زر نے دیوانہ بنا رکھا تھا وہ بھی اس اخلاقی حس کے تحت حرام کمائی سے کسی نہ کسی صورت دست کش رہتے اور اگر دوزخ کے ایندھن سے پیٹ بھرنا ضروری سمجھتے تو کم از کم اس دھندے کو معاشرے کی نظروں سے چھپا کر کرتے - اسے انسانیت کی بدقسمتی سمجھیے کہ صنعتی انقلاب کے بعد جب انسان نے سیم و زر کی پرستش شروع کی تو اسے یہ محسوس ہوا کہ حلال و حرام کا امتیاز اس راہ کا سنگِ گراں ہے - چنانچہ معیشت دانوں نے اس امتیاز کو مٹانے کے لیے یہ فلسفہ گھڑا کہ حصولِ دولت اور صرفِ دولت حیاتِ انسانی کا ایک ایسا شعبہ ہے جسے اخلاقی گرفت سے یکسر آزاد ہونا چاہیے اور انسانوں کو اس بات کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے کہ وہ دینی معتقدات کو معاشی معاملات میں دخیل نہ ہونے دیں - ایک برطانوی مصنّف ٹانی نے اپنی کتاب "مذہب اور سرمایہ داری کا عروج" میں اس فلسفے کے پس منظر پر بڑی مفصل بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح معیشت کو اخلاقی ضابطوں سے یکسر آزاد کرکے انسان کو دولت کماتے اور دولت صرف کرنے والا حیوان بنایا گیا ہے - یوں تو اس کتاب میں اس موضوع پر مختلف زاویوں سے اور مختلف انداز میں اور فنی دلائل کے ساتھ بحث کی گئی ہے لیکن اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے سارے مباحث میں یہی نظریہ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے کہ جب لوگ دولت کی محبت میں فی الحقیقت گرفتار ہوگئے ہیں اور دولت کا حصول ان کی زندگی کا منتہائے مقصود بن چکا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو اس حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ جو چیز اس مقصد کی راہ میں حائل ہو رہی ہے اُسے مٹا دیا جائے۔ دورِ حاضر کے لوگوں کا دولت کے بارے میں یہ اندازِ جنوں ہی اس کے صحیح اور برحق ہونے کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ اگر ہوسِ زر انسانی فطرت میں داخل نہ ہوتی یا اس سے مغائرت رکھتی تو انسانوں کی عظیم اکثریت دولت پرستی کا شیوہ کیوں اختیار کرتی؟ اس بنا پر صحیح مسلک دولت پرستی ہی ہے اور جو لوگ اسے غلط قرار دیتے ہیں اُنہیں لازمی طور پر کوئی نہ کوئی ذہنی عارضہ لاحق ہے۔

"جو کچھ موجود ہے وہی صحیح اور برحق ہے" کا نظریہ چونکہ غلط مفروضات پر قائم ہے اس لیے اس میں قدم قدم پر نہایت واضح تضادات پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ دنیا میں کسی فعل کا وجود ہی اس کے صحیح ہونے کی سب سے بڑی شہادت ہے تو اس دلیل کی بنا پر کسی جسمانی، اخلاقی اور روحانی بیماری کا مداوا فطرت کے خلاف کھلی جنگ ہے کیونکہ انسان شروع ہی سے ان عوارض کا شکار چلا آ رہا ہے۔ جسمانی بیماریوں سے ہر سال ان گنت افراد ہلاک ہوتے ہیں۔ اسی طرح حادثات سے لاکھوں جانیں ضائع ہو جاتی ہیں لیکن آج تک کسی نے اس انداز پر نہیں سوچا کہ ان بیماریوں اور حادثات کی روک تھام کے لیے جد و جہد ترک کر دی جائے کیونکہ یہ بیماریاں اور یہ حادثات ہماری زندگی کے معمولات بن چکے ہیں اور یہ چونکہ موجود ہیں اس لیے ان کا راستہ روکنے کے بجائے انہیں ہلاکت و تباہی لانے کے لیے کھلے مواقع فراہم کرنے چاہییں۔ اگر کسی اخلاقی روگ کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ انسانی فطرت میں داخل ہے اور اس سے نجات دلانے کی کوشش فطرت کے خلاف جنگ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جسمانی عوارض کو بھی فطرت کا تقاضا سمجھتے ہوئے انہیں اپنے مضر اثرات پھیلانے کی اجازت نہ دی جائے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی احمقانہ بات کرے تو سب اس پہ خندہ زن ہوں گے اور اس کو فاتر العقل سمجھتے ہوئے اس کی اس تجویز کو کسی لحاظ سے بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھیں گے لیکن اگر کوئی فرد یہ کہتا ہے کہ اخلاقی عوارض کی روک تھام کے لیے اخلاقی ضابطے عائد کیے جائیں تو اسے احمق اور انسانیت کا دشمن قرار دیا جاتا ہے درآنحالیکہ اخلاقی عوارض جسمانی عوارض سے کہیں زیادہ ہلاکت خیز ہوتے ہیں۔ جسمانی بیماریاں تو چند انسانوں کو موت کی نیند سلا دینے کا باعث بنتی ہیں مگر اخلاقی بیماریاں قوموں اور نسلوں کو برباد کر کے رکھ دیتی ہیں اور جو لوگ ان عوارض کی موجودگی میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں ان کے لیے حیاتِ مستعار کا ہر لمحہ سکراتِ موت سے کسی طرح (باقی اشارات بر صـ۲۴)

© rasailojaraid.com